مستشرقین اور قرآن کریم

(قسط اول)

محمد مصطفیٰ الاعظمی

عصر حاضر کے معروف علوم الحدیث کے ماہر ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی صاحب نے Toby Lester کے مضمون میں اٹھائے گئے شبہات کا جامع اور مدلل جواب لندن کے جریدے Impect International میں کئی اقساط میں تحریر فرمایا ہم شکریہ کے ساتھ اس کا ترجمہ اپنے قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

اسلام کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لا شریک، آقا، مالک، کائنات کا خالق اور ہر چیز کا پالن ہار ہے۔ وہ دانا، مہربان، انصاف کرنے اور سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔ اس کا علم لا محدود، اس کی راہنمائی ابدی اور زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے۔ وہ علیم وخبیر ہی جانتا ہے کہ ہم انسانوں کے لیے کیا اچھائی اور کیا برائی ہے۔ وہ قادرِ مطلق اور بے نیاز ہے اس نے ازل سے ہی اپنے تربیت یافتہ انبیاء اور پیغمبر لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجے تاکہ لوگوں کے سامنے نیکی اور اچھائی کی مثالیں پیش کر سکے اور انہیں برائی اور بدی سے آگاہ کیا جا سکے، انہیں دنیا اور آخرت میں نیکی کے ثمرات اور گناہ کے عذاب سے خبردار کیا جا سکے۔

اس کا اپنے بندوں پر فضل وکرم منطقی طور پر اس ہدایت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے خاتم النبیین حضرت محمدؐ پر ہمیشہ محفوظ رہنے والے قرآن کریم اور انسانیت کے لیے کتاب ہدایت کی صورت میں نازل کیا گیا۔ قرآن کریم

لوگوں کو سوچنے اور اپنی جانب متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے خیر اور شر میں واضح تفریق کر دی ہے، اب یہ انسانوں پر ہے کہ وہ جو بھی راستہ اختیار کریں۔

یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ جب غیر مسلم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں (خواہ ان کا مقصد جو بھی ہو) تو ان کے لیے (غیر مسلم ہونے کے ناطے) لازم نہیں کہ وہ (مسلمان کی طرح) حضور پاکؐ پر اور قرآن پاک کے وحی الٰہی اور آخری کتاب ہونے پر بھی ایمان رکھتے ہوں۔ چنانچہ انہیں تنقید و تنقیح اور استرداد کا حق ہے۔ تاکہ وہ اپنے لیے خود فیصلہ کر سکیں۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جب ایسے لوگ نہ سمجھنے کی حقیقی خواہش رکھتے ہوں نہ ایسا کرنے کی کوئی معروضی اور غیر جانبدارانہ کوشش کریں اور پھر بھی اپنے عجیب و غریب نظریات پیش کر کے سب سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کے جاہلانہ تصورات اور ناقص و مجہول علم و فضل سے متاثر ہو جائیں گے۔ اس بات کی مضحکہ خیزی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو مسلمانوں سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اگر مسلمان اپنے دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ مستشرقین کے تشریح کردہ اسلام کی پیروی کریں۔

ایسی ہی ایک کوشش، جو کسی طرح بھی پہلی نہیں ہے، ایک امریکی صحافی ٹوبی لیسٹر (Tobi Lester) نے امریکہ سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالے The Atlantic Monthly کے جنوری 1999ء کے شمارے میں "What is the Koran?" مضمون لکھ کر کی ہے۔ مختلف رسائل اور اخبارات میں بائبل کو نئے انداز اور نئے زاویے سے اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو تاریخ کے حوالے سے سمجھنے کی کوششوں پر مبنی مضامین اس کی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اسے اس بات پر حیرانی ہوئی تھی کہ کوئی قرآن کو بھی نئے زاویوں اور پیمانوں سے سمجھنے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر مضامین کیوں نہیں لکھ رہا؟

ایک متجسس صحافی، جیسا کہ وہ ہے، ٹوبی لیسٹر نایاب کتب کی دستیابی کے حوالے سے مشہور ایک لائبریری میں گیا اور پھر اس دعویٰ کے ساتھ واپس آیا کہ ''اس نے جو کچھ تلاش کیا ہے، اسے وہ متوازن اور غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کرنے کی پوری کوشش کرے گا''۔ اسی اثناء میں اسے معلوم ہوا کہ جرمن یونیورسٹی کے دو اساتذہ ڈاکٹر جیرڈ آر جوزف پوئن (Dr. Gerd R Joseph Puin) اور ڈاکٹر کیسپر گراف وان بوتھمر (Dr. Hans-Casper Graf Von Bothmer) کو قرآن پاک کے کچھ ایسے بوسیدہ اوراق ملے ہیں، جن کا تعلق پہلی یا دوسری صدی ہجری کے زمانے سے ہو سکتا ہے۔ اس میں سے کچھ اوراق کے ٹکڑوں میں آج کے مستند قرآنی مصحف سے کسی قدر انحراف پایا جاتا ہے۔ مسٹر ٹوبی لیسٹر نے سوچا کہ یہ بات مسلمانوں کے لیے تو تکلیف دہ ہو سکتی ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے بہرحال دلچسپی اور کشش کا باعث ہو گی جو نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ''اصلاح مذہب'' کی ویسی ہی ایک تحریک، جس کا سامنا اس سے پہلے عیسائیت کر چکی ہے۔

ٹوبی لیسٹر کے اندر کے صحافی نے سوچا کہ ایک بہت دلچسپ کہانی اس کے ہاتھ لگ گئی ہے، اور وہ فوراً اسے شائع کرانے کے لیے دوڑا۔ مسلمانوں کے لیے اس کہانی میں کوئی نئی بات اس لیے نہ تھی کہ وہ روز اول سے ایسی کہانیاں سنتے آئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اشتراکیت کے خلاف سرد جنگ میں کامیابی کے بعد، مغرب میں قدیم ''اسلام فوبیا'' کے تحت یہ سوچ پیدا ہو چکی تھی کہ اب وقت ہے کہ ''پرانے دشمن'' یعنی اسلام سے بھی نپٹ لیا جائے۔ محاورے کے مطابق عوام کی یاد داشت کمزور ہوتی ہے، اور تاریخ کی یاد داشت شاید اس سے بھی کمزور.....اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن اور حدیث پر مستشرقین کے چند اہم قدیمی اعتراضات کو دوہرالیں۔

مستشرقین نے قرآن کریم پر جو اعتراضات کیے ہیں، انہیں کسی منطق سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ اعتراض برائے اعتراض کی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن زبانی ہی کیوں نازل ہوا اور پھر اکٹھا کیا گیا اور یہ کہ کوئی بھی چیز جو زبانی ہو قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔ پھر جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت رسول اللہؐ اسے تحریری شکل میں محفوظ کر دیا کرتے تھے، تو اس بات پر بھی وہ جھٹ سے اعتراض جڑ دیتے ہیں۔ یہ لوگ دور اول میں حضرت ابوبکر کے زمانے میں اکٹھا کیے جانے والے تحریری اثاثے پر بھی بلا تکلف اعتراض وارد کر دیتے ہیں۔

کچھ مستشرقین خلیفہ سوم حضرت عثمان کے اس کارنامے کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے تمام نسخوں کو جمع کر کے چار (اور بعض روایتوں میں سات) مستند اور مصدقہ نسخے سرکاری طور پر منظور کیے اور پھر انہیں مرکزی شہروں میں بھیجا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مستشرقین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ یہ کام محمدؐ کی رحلت کے پندرہ برس بعد ہوا، اس لیے ان کے خیال میں قرآن کا متن متاثر ہوا ہوگا۔ حالانکہ خود عہد نامۂ قدیم کی کچھ کتب تو پانچ سے آٹھ سو برس تک زبانی روایت کے بل پر اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی رہی تھیں۔ اس کے برعکس اہل علم و دانش نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حضرت عثمان کو ''جامع القرآن'' صرف ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم امہ کو قرآن کے ایک مصحف (نسخے) پر اکٹھا کیا، اور کھلی اسمبلی منعقد کر کے اس کی تصدیق کی۔ اس ضمن میں انہوں نے اسی نسخے پر انحصار کیا جو خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے ذریعے ان تک پہنچا تھا۔

مستشرقین نے اپنے فہم کے مطابق عربی کے ابتدائی تلفظ و املا (Orthography) میں غلطیاں تلاش کیں۔ جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن کی آیات لکھنے اور پھر انہیں پڑھنے میں غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ تاہم نزول قرآن سے پہلے عربی میں کتاب لکھنے کا عام طور پر کوئی رواج نہیں تھا۔ جنہوں نے اس وقت کچھ لکھا بھی، خصوصاً شاعری، انہوں نے بھی اسے زبانی روایت کے مطابق ہی تحریر کیا۔ اس وقت تحریر و تقریر کی زبان میں فرق نہ ہونے کی بنا پر لفظی ترنم اور تلفظ یا صرف ونحو میں کچھ فرق کا ہونا بالکل معمول کی بات تھی۔ ویسے بھی اس وقت تک عربی میں جملہ رموز و اوقاف اور اعراب کے استعمال کا رواج نہیں تھا، اس لیے ان کا استعمال بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا یہ ضبط تحریر میں لایا جاتا رہا۔ اس کے ساتھ

قرآن کے کتابی نظم و ضبط اور زبان کی دوسری ضروریات کے زیر اثر خود عربی زبان کی تحریر میں بھی پختگی آتی چلی گئی۔

چنانچہ حضرت محمدؐ کی رحلت کے صرف پچاس برس کے اندر اندر عربی رسم الخط اس قدر معیاری بن چکا تھا کہ ابتدائی تلفظ و اِملا کے فرق اور مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ اس عمل نے ایسے رسم الخط کو فروغ دیا جو قرآن پاک کے متن کی وضاحت کر پائے۔ جیسا کہ بعض مستشرقین کا بھی خیال ہے کہ قرآن نے عربی زبان میں تلفظ کا تعین اور وضاحت کر دی ہے۔ تاہم مستشرقین اس خیال کو بھی عام کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ''عربی زبان کو قرآن کی عربی سے علیحدہ کیا جائے اور عربی زبان اپنے مختلف علاقائی لہجوں میں ہی سمجھی جانی چاہیے نہ کہ اسے قرآن کی معیاری زبان کا پابند بنایا جائے''۔

مستشرقین کا اصرار اس بات پر رہا کہ آنحضورؐ کی رحلت اور حضرت عثمان کی رہنمائی میں قرآن پاک کے ایک مستند مصحف کی تیاری میں پندرہ سال کا وقفہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ اتنا طویل عرصہ ہے کہ قرآن پاک کا متن متاثر ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم کے یہ ناقدین اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن پاک دونوں یعنی زبانی اور تحریری شکلوں میں بیک وقت محفوظ کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو قرآن کو تحریر کیا جا رہا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری جانب اسے حفظ بھی کیا جا رہا تھا۔ قرآن پاک کو محفوظ اور شائع کرنے کا یہ دوہرا حفاظتی نظام تھا، جس نے قرآن پاک میں غلطی کے امکان کو ختم کر دیا۔ جب اسے لکھا گیا اور حفظ کیا گیا تو پھر اگر الفاظ اور ان کی ادائیگی کا کوئی فرق تھا بھی تو وہ مکہ کے تلفظ میں قرآن پاک کی جمع و تدوین کے بعد غیر اہم، بلکہ ختم ہو کر رہ گیا۔

جو لوگ کسی ایسی الہامی کتاب کے قائل ہی نہیں ہیں جس میں ہمیشہ کے لیے نوع انسانی کی راہنمائی کا سامان موجود ہو، وہ کسی صورت اپنی اصلاح کے لیے تیار نہیں۔ کچھ لوگوں نے قرآن پاک کو زبانی (بذریعہ حفظِ قرآن) دوسرے لوگوں تک منتقل کرنے میں کوئی خرابی تلاش کی، اور کچھ لوگوں کو قرآن پاک قلم بند کرنے میں خامی نظر آئی۔

اسی طرح دوسری جانب یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ عبرانی رسم الخط دو مرتبہ تبدیلی کے عمل سے گزرا ہے۔ عبرانی رسم الخط نے پہلے اس وقت شکل تبدیل کی جب یہودی بابلیوں (Babylonian) کی غلامی سے آزاد ہو کر فلسطین (Philistine) پہنچے۔ نیا رسم الخط بھی اگرچہ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہوا تاہم یہ آئندہ دو ہزار برس تک برقرار رہا۔ مسلمانوں سے میل جول اور رابطے کے بعد ہی یہودی اس قابل ہوئے کہ عبرانی رسم الخط کو معیاری (Standardise) بنا سکیں۔

ہمارے پاس آج بھی قرآن پاک کے وہ نسخے محفوظ ہیں، جن کا تعلق پہلی صدی ہجری سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کب اور کن تاریخوں میں وہ نسخے مرتب ہوئے۔ لیکن مستشرقین کے مطابق ''یہ نسخے اتنے عرصے بعد

میں مرتب ہوئے ہیں کہ انہیں قابل اعتبار قرار نہیں دیا جا سکتا''۔ جب کہ گریگوری کیلنڈر کے مطابق ابتدائی انجیل (Gospel) کا تعلق نوی صدی سے اور عہد نامہ عتیق کا دسویں صدی سے تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں تحصیل علم کا یہ ایک ضروری حصہ سمجھا جاتا تھا کہ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کا علم دوسرے افراد تک وہی لوگ منتقل کریں، جنہوں نے ان کا علم اصل مآخذ اور اولین دور کے اساتذہ سے حاصل کیا ہو۔ اس احتیاط اور احساس ذمہ داری کے باعث فارغ التحصیل طلباء کی سند فضیلت پر ان کے ہر استاد کے تعلیمی شجرۂ کی تفصیل لکھنے کا نظام وجود میں آیا، جو آج تک برقرار رہے۔ یوں طالب علم کا تعلق اساتذہ کے ایک ایسے نہ ٹوٹنے والے سلسلے سے قائم ہو جاتا تھا جو اسلام کے ابتدائی دنوں تک جاتا۔ لہذا جعلی اسناد کے اجرا یا نقلی گریجویٹ کے در آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخوں میں ان لوگوں کی تعداد لاکھوں میں تھی، جنہوں نے ذاتی طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کیا اور جن کے سامنے روز مرہ کے معاملات کے بارے میں اسلام کی جانب سے راہنمائی وقوع پذیر ہوتی رہی۔ اجتماعی زندگی کے ان لمحہ بہ لمحہ مسائل پر وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنی یاداشتوں اور تحریروں کا موازنہ کرتے تھے اور جتنا ممکن ہوتا، صداقت اور درستی سے علم، فہم اور تجربہ دوسروں تک منتقل کرتے تھے۔ یہ لوگ صحابہ کرام کے ساتھی تھے، جو اس علم کو سیکھنے اور محفوظ کرنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اپنے پاس سے کسی چیز کا اضافہ کرنے یا اپنی مرضی سے اس کی نفی کرنے یا اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ سے منسوب کرنے کا مطلب اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود و مقہور بنا لینے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود ہر راوی کی اہلیت اور اس کے مکمل قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں کڑی چھان پھٹک کی جاتی، پھر روایات کی صداقت جاننے کے لیے ان کو غیر جانبدارانہ انداز میں پرکھا جاتا، اور قرآن پاک کی جملہ تعلیمات سے موازنہ کیا جاتا۔ اس طرح اسلامی مآخذ کو ابتدائی دنوں سے ہی محفوظ کر کے لوگوں تک پہنچا دیا گیا۔ صداقت اور درستی کا یہ معیار جو ابتدائی مسلمان علماء نے قائم کیا تھا، آج بھی دنیا بھر کے نظام ہائے تعلیم میں ایک لاثانی مثال ہے۔ یہ مثال اتنی قابل تحسین ہے کہ کسی ''کافر'' ذہن کے لیے اسے سچ تسلیم کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ کچھ مستشرقین اس کو استہزایہ انداز میں ''سالویشن ہسٹری'' (تاریخ نجات) کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید کے ساتھ موازنہ، شاید اس حقیقت کو واضح کرنے میں مدد دے گا کہ اسلامی مآخذ کی اصلیت، سچائی اور صحت کو محفوظ رکھنے کے لیے کس قدر احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی تمام کتب کے مرتبین کے احوال و آثار کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ تاریخ میں یہودیت اور عیسائیت بطور مذاہب موجود ہیں، لیکن ہم کسی کو عہد نامہ عتیق کا مسلمہ مصنف نہیں کہہ سکتے۔ ابتداء میں اسے ایک الہامی کتاب سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ کہا گیا کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس بارے میں اب جدید نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ عہد نامۂ عتیق کو بہت سے مصنفین نے کئی ہزار سالوں کے عرصے میں قلم بند کیا

اور یہی بات حضرت موسیٰؑ سے منسوب پانچ کتابوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

ہم ان مصنفین کی تعلیمی قابلیت، اہلیت اور احوال زندگی کے بارے میں نہایت معمولی معلومات رکھتے ہیں اور جملہ تفصیلات سے بے خبر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مذکورہ واقعات کے بارے میں ان کا علم کیا تھا؟، کیا وہ محض تماشائی تھے یا وہ ان واقعات میں عملاً شریک بھی رہے؟ تاریخی حوالے سے وہ ان واقعات کے کتنا قریب یا دور تھے یا یہ کہ ان کی یادداشت اچھی تھی؟ وہ کتنے سچے، پاک باز اور کتنے غیر جانب دار اور کس قدر احتیاط برتنے والے لوگ تھے؟ سماجی زندگی میں کیا وہ معتبر اور مستند لوگ سمجھے جاتے تھے؟ اور یہ کتابیں آج ہم تک کن کن وسیلوں اور ذریعوں سے پہنچی ہیں؟ جس واحد چیز کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عہد نامۂ عتیق کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور پھر چند سو سالوں کے لیے غائب ہو گئیں۔ پھر کچھ چیزیں منظر عام پر آئیں جنہیں مستند قرار دے دیا گیا اور پھر یہ کئی سو سالوں کے لیے غائب ہو گئیں، آخر کار ان کو اچانک دوبارہ دریافت کر لیا گیا۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ تورات اور زبور الہامی کتابیں ہیں، جو بالترتیب حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئیں، لیکن وہ گم ہو گئیں۔ موجودہ عہد نامہ عتیق کے کچھ حصوں میں اصل وحی کا مفہوم ہو سکتا ہے لیکن سب کچھ اتنا گڈ مڈ ہو گیا ہے کہ اب اصل مواد سے اضافہ شدہ مواد کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کی صداقت کو تسلیم کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ جہاں قرآن کے پیغام سے موافقت ہو، وہاں انہیں وحی سے قریب تر مان لیا جائے۔

علم و تحقیق کے میدان میں جب کوئی نظریہ پیش کیا جاتا ہے، تو اس کی صداقت اور معقولیت متعین کرنے کے لیے اس کو معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں پرکھا جاتا ہے۔ اگر یہ نظریہ ناکام ہو جاتا ہے یا اس میں کوئی کمی بیشی رہ جاتی ہے تو اس کو تبدیل یا درست کر لیا جاتا ہے یا مکمل طور پر ترک بھی کر دیا جاتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جب اسلام کی بات آتی ہے تو اس کے بارے میں نیم پختہ، غیر مصدقہ اور غیر مستند نظریے کو بھی مغرب میں آنکھیں بند کر کے قطعی صداقت کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے، چاہے اس کے کذب و افترا، کج روی اور بودے پن کو دو اور دو چار کی طرح غیر جانبدارانہ اور فیصلہ کن انداز میں واضح بھی کر دیا جائے۔ معروضیت اور عدم تعصب کے علم بردار یہ مستشرقین کبھی اس قسم کے جھوٹے نظریات کو پھیلانے سے باز نہیں آتے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک مشہور اور مستند حدیث بیان کی گئی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر استوار ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پانچ وقت نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ لیکن پروفیسر وینزنک (Wensinck) اس حدیث کو اس لیے خود ساختہ قرار دیتا ہے کیوں کہ اس میں کلمہ شہادت کے الفاظ موجود ہیں۔

وینزنک کے خیال میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شام میں عیسائیوں سے ملنے کے بعد کلمہ وضع کیا، جن کا اپنا ایک کلمہ تھا۔ مگر اس خود ساختہ نظریے میں ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ کلمہ شہادت، تشہد کا ایک حصہ

ہے، جو کہ پانچ وقت کی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کو کسی سے ادھار لینے یا نقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بجائے اس کے کہ ویزنک اپنے اس نظریے کی اصلاح کرتا اس نے ایک اور نظریہ پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز کا معیار (طریقہ کار) حضورؐ کی وفات کے بعد قائم کیا گیا اور اس طرح سے کلمۂ شہادت کو تشہد میں شامل کر کے نماز کا حصہ بنا دیا گیا۔(۱) اس سب کے باجود مسٹر ویزنک کو اس چیز کی وضاحت کرنے کی پھر ضرورت ہے کہ کیوں اور کس طرح کلمہ شہادت اذان اور اقامت دونوں کا حصہ بنا، اور اسلام میں ان کو کب شامل کیا گیا؟ مگر وہ ادھورا دعویٰ پیش کرنے کے بعد اگلے سوال کو گول کر گیا۔

مستشرقین اس بنیادی سوال سے لاتعلق نظر آتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ یا اسلامی مآخذ اسلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ان کی سوچ اور رویہ ایسا نہیں جیسا کہ عام طور پر ہونا چاہیے۔ یعنی سب سے پہلے اسلام کو اس طرح لیا جانا چاہیے جیسے وہ خود اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے اور ضرورت ہو تو وہ اسلام کے اوپر سوال اور اعتراض پیش کریں۔ لیکن اس کے برعکس ان کا مقصد مسلمانوں کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے سارا زور صرف کرنا ہے کہ اسلام کو اسی طرح (غلط یا صحیح) سمجھا جائے جیسے مستشرقین اسلام کو سمجھتے یا جانتے ہیں یا جس طرح کا اسلام مستشرقین خود دیکھنا چاہتے ہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پروفیسر ای بوس ورتھ جو کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ایڈیٹروں میں سے ایک ہیں، کولوریڈو یونیورسٹی (بولڈ، امریکہ میں لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے بعد سوال میں ان سے پوچھا گیا کہ ''آپ نے اس علمی کام میں مسلمان اسکالرز کا حصہ ادا کرنے سے کیوں الگ کر دیا ہے؟ حتیٰ کہ ان مسلمان اسکالروں کو بھی جن کی تعلیم و تربیت مغربی تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی، تحریری کام سے روک دیا گیا حالانکہ انسائیکلو پیڈیا کا وہ بنیادی حصہ، جس کا تعلق قرآن، حدیث، جہاد وغیرہ سے ہے، اس میں وہ لوگ بہتر معاونت فراہم کر سکتے تھے''۔ پروفیسر بوس ورتھ نے ذرا صاف گوئی سے جواب دیا:

''مغربی اسکالرز، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، اہل مغرب کے لیے لکھ رہے ہیں''۔

بوس ورتھ کی اس صاف گوئی کی ہم تحسین کریں گے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تجویز کریں گے کہ انہیں جرأت سے کام لے کر اس تخلیقی کاوش کا نام بھی ایسا ہی رکھنا چاہیے مثلاً اہل مغرب کے لیے اہل مغرب کا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (Encyclopaedia of Islam- by the Westerners, for the Westerners)

غور کیا جائے تو پروفیسر بوس ورتھ نے کوئی نئی بات نہیں کہی، بلکہ انیسویں صدی کے جرمن نژاد دانشور کارل مارکس کے اس نسل پرستانہ نعرے ہی کو دوہرایا ہے، کہ "The cnanot represent themselves; they must be represented" (جو نمائندگی نہیں کر سکتے، ان کی نمائندگی کی جائے)۔(۲)

لہذا، اگر ایک جانب مغربی استعمار نے دوسری اقوام کے ممالک، وسائل اور علاقوں پر قبضہ جمایا تھا، تو دوسری جانب مستشرقین نے ان محکوموں کے ایمان، تاریخ، ثقافت اور شناخت کو مسخ کرنے کا کام کیا۔ دوسرے

لفظوں میں مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کا فہم ان مستشرقین کی اسلام کے بارے میں ''لاعلمی'' سے حاصل کریں گے۔

حوالہ جات

(۱) (A.J. Wensinck, Muslim Creed, Cambridge, 1932. p 19-32)

(۲) (Edward said, Orientalism, Vintage Books, New Yark, 1979.

☆☆☆☆☆

حاضر جواب لڑکا

امیر اسماعیل گیلانی کا منہ بولا بیٹا چیچک کے مرض کا شکار ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اسکے چہرے کی خوبصورتی ختم ہو گئی۔ ایک دن بیٹا امیر اسماعیل کے سامنے کھڑا تھا، امیر کو اسکی خوبصورتی کے زائل ہو جانے پر بہت افسوس ہوا کہ اتنا خوبصورت جوان کس قدر بدصورت ہو گیا ہے۔ قاضی ابو منصور بھی اس محفل میں موجود تھا وہ امیر اسماعیل کی کیفیت بھانپ گیا اور اس نے فوراً یہ آیت پڑھی:

لقد خلقنا الا نسان فی احسن تقویم ثم ردد ناہ اسفل سافلین (تین۔۴،۵)

''ہم نے انسان کو خوبصورت ترین شکل میں پیدا کیا پھر اسکو بدصورت ترین شکل کی طرف پھیر دیا''۔

چونکہ خود قاضی کوئی اچھی شکل وصورت والا نہ تھا، لہٰذا بیٹے نے برجستہ جواب دیا

وضرب لنا مثلا ونسی خلقه (یسین۔۷۸)...... ''ہمارے لئے مثال دی اور اپنی خلقت کو بھول گیا''۔

قاضی بہت شرمندہ ہوا۔ لوگوں نے لڑکے کی حاضر جوابی پر اسے داد دی۔